منیر نیازی
دشمنوں کے درمیان شام

منیر نیازی

دشمنوں کے درمیان شام

کتاب نگر

لکھنؤ

ناشر — کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ

طابع — نظامی پریس، لکھنؤ

خطاط — ظہور احمد

تعداد — ۵۰۰

سن اشاعت — ۱۹۷۵ء

قیمت — دس روپے

سرورق کا ڈیزائن — نیر مسعود

دشمنوں
کے
درمیان
شام

ہندوستانی ایڈیشن سید اطہر مسعود رضوی کے زیرِ اہتمام
مصنف کی اجازت سے شایع کیا گیا

فہرست

حصہ نظم

دوسرے مجموعے جنگل میں دھنک سے

امام حسین

علیہ السّلام

کے نام

حصۂ نظم

حمد

شام شہر ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو
یاد آکر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

آرزو دیتا ہے دل کو موت کی وقت دعا
میری ساری خواہشوں کا یہ صلہ دیتا ہے تو

حد سے بڑھ کر سبز ہو جاتا ہے جب رنگ زمیں
خاک میں اس نقشِ رنگیں کو ملا دیتا ہے تو

ماند پڑ جاتی ہے جب اشجار پر ہر روشنی
گھپ اندھیرے جنگلوں میں لا بتہ دیتا ہے تو

دیر تک رکھتا ہے تو ارض و سما کو منتظر
پھر انھیں ویرانیوں میں گل کھلا دیتا ہے تو

تیز کرتا ہے سفر میں موج غم کی یورشیں
بجھتے جاتے شعلۂ دل کو ہوا دیتا ہے تو

اے منیرؔ اس رات کے افلاک پر ہونا ترا
اک حقیقت کو فسانہ سا بنا دیتا ہے تو

وصال کی خواہش

کہہ بھی دے اب وہ سب باتیں
جو دل میں پوشیدہ ہیں
سارے روپ دکھا دے مجھ کو
جو اب تک نادیدہ ہیں

ایک ہی رات کے تارے ہیں
ہم دونوں اس کو جانتے ہیں
دوری اور مجبوری کیا ہے
اس کو بھی پہچانتے ہیں

کیوں پھر دونوں مل نہیں سکتے
کیوں یہ بندھن ٹوٹا ہے
یا کوئی کھوٹ ہے تیرے دل میں
یا میرا غم جھوٹا ہے

ایک خیال

دنیا سے دور اس کی بھری محفلوں سے دور
بھٹکا ہے دل ہوا کی طرح منزلوں سے دور
اٹھی ہے موج درد کوئی دل کے آس پاس
پھرتی ہے اک صدا سی کہیں ساحلوں سے دور

شام، خوف، رنگ

بجلی کڑک کے تیغ شرر بار سی گری
جیسے گھٹا میں رنگ کی دیوار سی گری
دیکھا نہ جائے گا وہ سماں شام کا منیر
جب بام غم سے خوشبو کوئی ہار سی گری

خوب صورت خیال

چھوڑو تو چھوٹ جائیں
پکڑو تو ٹوٹ جائیں
صابن کے بلبلے سے
رنگین آئینے سے

وہ دونوں

اک تصویرِ اداس
اک سایہ خاموش
اپنے اپنے خواب میں
بری طرح مدہوش

مینھ، ہوا اور اجنبی شہر

بارش تھی دیواروں پر اور کوٹھوں پر
اور گھروں کے گھنے درختوں پر
تند ہوا تھی، چہروں پر، دروازوں پر
اور خالی رستوں پر
روشنیاں تھیں کہیں کہیں
درگاہوں میں یا اونچے سرد مکانوں میں
ہوگا وہ بھی وہیں کہیں
ویرانوں میں یا مرمر کے ایوانوں میں

ساتھیوں کی تلاش

کچھ اپنے جیسے لوگ ملیں
ان رنگ برنگے شہروں میں

کوئی اپنی جیسی لہر ملے
ان سانپوں جیسی لہروں میں

کوئی تیز نشیلا زہر ملے
اتنی قسموں کے زہروں میں

ہم بھی نہ گھر سے باہر نکلیں
ان سونی دوپہروں میں

دیکھنے والے کی الجھن

سورج میں جو چہرے دیکھے اب ہیں سپنے سمان
اور شعاعوں میں الجھی سی
گیلے گیلے ہونٹوں کی وہ نئی لال مسکان
جیسے کبھی نہ زندہ تھے یہ

چھوٹی چھوٹی اینٹوں والے ٹھنڈے برف مکان
کہاں گئی وہ شام ڈھلے کی
سرسر کرتی تیز ہوا کی دل پر کھنچی کمان

اور سپنا جو نیند میں لایا
پوری ادھوری خواہشوں کا
اک درد بھرا طوفان
کیسے کوئی کر سکتا ہے ان سب میں پہچان

آدمی

بھولی باتیں یاد نہ آئیں
کیا کیا کوشش کرتا ہے

کون ہے وہ بس اسی سوچ میں
سائے سے بھی ڈرتا ہے

جیسے سکھ کے طوفانوں میں
دکھ کا ریلا پھرتا ہے

ساتھ اپنے جمگھٹا لگا کر
آپ اکیلا پھرتا ہے

گزرگاہ پر تماشا

کھلی سڑک ویران پڑی تھی
بہت عجب تھی شام

اونچا قد اور چال نرالی
نظریں خوں آشام

سارے بدن پر مچا ہوا تھا
رنگوں کا کہرام

لال ہونٹ یوں دہک رہے تھے
جیسے لہو کا جام

ایسا حسن تھا اس لڑکی میں
ٹھٹھک گئے سب لوگ

کیسے خوش خوش چلے تھے گھر کو
لگ گیا کیسا روگ

ساحلی شہر میں ایک رات

روشنیاں ہی روشنیاں اور نوح تھکے جہازوں کے
بارش میں جادو کے منظر کھلے ہوئے دروازوں کے

لاکھ جتن سے بھی نہیں مانا
دل کو دکھایا بیتے دن کے ہنگاموں کا تماشا بھی
شہر ہے سارا پتھر جیسا

میرا بھی دشمن ہے یہ اور اس کے لہو کا پیاسا بھی
میں بھی اپنی سوچ میں گم ہوں
پاگل ہو کر ناچ رہی وہ ہوٹل کی رقاصہ بھی

ساتواں در کھلنے کا سماں

ڈوب چلا ہے زہر میں اس کی آنکھوں کا ہر روپ
دیواروں پر پھیل رہی ہے پھیکی پھیکی دھوپ
سناٹا ہے شہر میں جیسے ایسی ہے آواز
اک دروازہ کھلے گا جیسے کوئی پرانا راز

حسن میں گناہ کی خواہش

حسن تو بس دو طرح کا خوب لگتا ہے مجھے
آگ میں جلتا ہوا
یا برف میں سویا ہوا
درمیاں میں کچھ نہیں

صرف ہلکا سا اچنبھا، عکس سا اڑتا ہوا
اک خیال انگیز قصہ اپنی آدھی موت کا
اک الم افزا افسانہ خونِ دل کے شوق کا
اک کنارے سے صدا دو تو وہ چلتی جائے گی
دور تک اپنے گنہ پر ہاتھ ملتی جائے گی

دشمنوں کے درمیان شام

پھیلتی ہے شام دیکھو ڈوبتا ہے دن عجب

آسماں پر رنگ دیکھو ہو گیا کیسا غضب

کھیت ہیں اور ان میں اک روپوش سے دشمن کا شک

سرسراہٹ سانپ کی گندم کی وحشی گرمہک

اک طرف دیوار و در اور جلتی بجھتی بتیاں

اک طرف سر پر کھڑا یہ موت جیسا آسماں

کہسار مری میں سردیاں

چاند نکلا بادلوں سے رات گہری ہوگئی
جیسے یہ دنیا خدا کی گونگی بہری ہوگئی
دیکھ کر مجھ کو وہ ناگن اور زہری ہوگئی
جسم ریشم بن گیا رنگت سنہری ہوگئی
سر کے اوپر شاخ تھی اور اس کے اوپر آسماں
آنکھ اس کی سرخ اور رنگت سنہری ہوگئی

لال پیلی چاندنی برفوں پہ ڈھلتی دیکھنا
بے ثمر اندھی نظر رنگوں سے جلتی دیکھنا
ایک خواہش سو طرح کے رُخ بدلتی دیکھنا

ڈھاکہ کے بلدا باغات میں تماشا

دور تک جاتی ہوئی پتھر کی کالی سیڑھیاں
اور گھرے لال پتے پیڑ کے
گھر کو تکتی دو نگاہیں ایک کالے جسم کی
بن کی پوشیدہ جگہوں کے اوٹ سے
دو عجائب گھر کے کمرے ایک خونی داستاں
خوبصورت مرد و زن کی انجمن آرائیاں
اپنی حد سے آگے بڑھ کر گرم خوں کی تیزیاں
بے وفائی کی پرانی رسم کے سود و زیاں
چھپ چلیں افلاک پر دیکھو شفق کی سرخیاں
اک پرانی شب کا قصہ چھیڑ کے
دور تک جاتی ہوئی پتھر کی خالی سیڑھیاں
اور گھرے لال پتے پیڑ کے

دھوپ میں ایک غیر آباد شہر کا نظارہ

ایک کنواں تھا بیچ میں اک پیتل کا مور
خالی شہر ڈراؤنا کھڑا تھا چاروں اور

دھوپ میں دو سفید عورتیں

ادھر تھا مندر بھیروں کا
ادھر ہوا تھی راہوں میں
دھوپ تھا شیشہ چاندی کا
چمک گیا جو نگاہوں میں

شب ماہ میں سیر کے دوران

ایک مکاں کے دس دروازے
کھلے پڑے ہیں سارے
اندر باہر کوئی نہیں
کوئی چاہے لاکھ پکارے

میں جیسا بچپن میں تھا

میں جیسا بچپن میں تھا
اسی طرح میں اب تک ہوں
کھلے باغ کو دیکھ دیکھ کر
بری طرح حیران
آس پاس مرے کیا ہوتا ہے
اس سب سے انجان

زندگی کی رنگا رنگی

دکھ بھی تھا اس کو شادی کا
خوش بھی ہے وہ دیکھو کتنی

اپنے گھر کے صحن میں

دیواروں پر ہری بیل ہے
اس سے اوپر تارے ہیں
سب سے اوپر کھلا آسمان ہے
اور اس کے نظارے ہیں

خدا کو اپنے ہم زاد کا انتظار

اداس ہے تو بہت خدایا
کوئی نہ تجھ کو منانے آیا
وہ سُر جو تیرے اجاڑ دل میں
چراغ بن کر چمک رہی ہے

کوئی نہ تجھ کو دکھانے آیا
عجیب حسن مہیب جیسی
خلش جو دل میں کھٹک رہی ہے

ایک دھندلا سا خواب

کبھی کہاں سی نئے چاند کی
اور اس کی خوشبو
آس پاس گہرے رنگوں کا
زہریلا جادو
ایک پیڑ اور ایک سانپ سا
اک میں اور اک تو

ہونے کا غم کس کو نہیں

ہونے کا غم اسے بھی ہے
اور مجھ کو بھی
کبھی نہ ہونے کا اندیشہ
اسے بھی ہے اور مجھ کو بھی

ایک لمحہ تیز سفر کا

اک ربن کسی کی زلفوں کا
بیمار مہک کسی جنگل کی
رنگین جھلک کسی بادل کی

دروازے بڑے مکانوں کے
کچھ پھول کھلے دالانوں کے
کچھ رنگ چھپے ویرانوں کے
فانوس کھلی دکانوں کے

اک لڑی میں اڑتے آتے ہیں
اور واپس مڑتے جاتے ہیں

ایک بہادر کی موت

زخمی دشمن حیرت میں ہے
ایسا بھی ہو سکتا تھا
اس کو شاید خبر نہیں تھی

اب وہ گھڑی حیرت میں ہے

آسمان پر رب ہے اس کا اور صدائیں یاروں کی
آس پاس شکلیں ہیں اس کے لہولہان سواروں کی
دل میں اس کے خلش ہے کوئی، شاید گئی بہاروں کی
کھیل ذرا ہونی کے دیکھو اور جفا اغیاروں کی

فتح کے بدلے موت ملی اسے گھر سے دور دیاروں کی

ایک شہر میں شام

چلی ہوائیں باغوں میں

اڑے ہیں رنگ چراغوں میں

چھپا ہے غم آوازوں میں

کھلے ہوئے دروازوں میں

آدھی رات میں ایک نیم وا دریچہ

آدھا چہرہ روشنی میں ہے آدھا کالے پردے میں

ایک آنکھ ہے سورج جیسی ایک ہے کالے پردے میں

بھید نہ اب تک باہر آیا آدھے گرے نقابوں سے

آنکھ ہمیشہ گھری رہی ظاہر اور چھپے سرابوں سے

سیرِ سحر آب زارِ بنگال

رخصت سرما کی صبح، سرد، نم، سنگین سی
خواب خاموشی کی تہ میں اک جھلک رنگین سی

بانس کا جنگل، ہوا، پانی پرانی جھیل کا
سبز ڈر پر رنگ جیسے آسماں کے نیل کا

گرتے جاتے شہر دونوں سمت اک انبار میں
کھنچتی جاتی خاک میداں ایک ہی رفتار میں

ملتے جاتے نقش سے کچھ پھیلتی دیوار پر
بجھ کے گرتے حرف سے حد سفر آثار پر

ہر طرف خوشبو ہوا میں، بن میں قرب آب کی
ایک پر اسرار خواہش دل میں مرگ آب کی

ایک دوزخی شہر پر بادلوں کے لیے دعا

گرم رنگ پھولوں کا
گرم تھی مہک ان کی
گرم خون آنکھوں میں
تیز تھی چمک ان کی

سوچتا میں کیا اس کو
اس حسیں کی باتوں کو
دیکھتا میں کیا اس کے
خاک رنگ ہاتھوں کو

خوف تھا تمازت میں
عیش شب کی شدت کا
در کھلا تھا دوزخ کا
لمس لب کی حدت کا

میں جواب کیا دیتا
اس کی ان اداؤں کا
ایک شہر مردہ میں
دور کی نداؤں کا

سحر زرد باطن میں
پانچ بند اسموں کا
بن گیا تھا جسموں میں
زہر پانچ قسموں کا

بے سود سفر کے بعد آرام کا پل

پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام و سحر
پھر وہی خواب تمنا پھر وہی دیوار و در

بلبلیں، اشجار، گھر، شمس و قمر
خوف میں لذت کے مسکن جسم پر ان کا اثر

موسموں کے آنے جانے کے وہی دل پر نشاں
سات رنگوں کے علم نیلے فلک تک پر فشاں

صبح دم سونے محلے بھیکی بھیکی سہ پہر
پھول گرتے دیکھنا شاخوں سے فرش شام پر

خواب اس کے دیکھنا موجود تھا جو بام پر
پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام و سحر

حرفِ سادہ و رنگین

اک کلی گلاب کی

کوچۂ چمن میں ہے

یاد ایک خواب کی

شام کے گگن میں ہے

اسم سبز باب کا

پر فریب بن میں ہے

نقش اک شباب کا

سایۂ کہن میں ہے

اک پکارتی صدا

جبر کے گھن میں ہے

دور دور تک ہوا

کوہ اور دمن میں ہے

ایک احتمال

شاید وہ ملے انھیں راہوں پر جن راہوں پر چھوڑا تھا اسے
کرنوں کی کلیاں چنتے ہوئے
مری جانب دوڑتے آتے ہوئے
پھر رک کر واپس جاتے ہوئے
شاید وہ موسم اب تک ہو جس موسم میں دیکھا تھا اسے

خزاں زدہ باغ پر بوندا باندی

آمدِ باراں کا سناٹا
کبھی کبھی اس سناٹے میں ٹوٹ کے گرتے پتے
دیو آسا اشجار کھڑے ہیں
کہیں کہیں اشجار تلے ویران پرانے رستے

لے کے چلیں آوارہ ہوائیں
ایک نشانی اس کی جو تھی اس کو واپس پہنچانے
آج بہت دن بعد آئی ہے شام یہ چادر تانے
اک وعدہ جو میں نے کیا تھا اس کی یاد دلانے

آج بہت دن بعد ملے تھے گہری پیاس اور پانی
ساحلوں جیسا حسن کسی کا اور میری حیرانی

خاکی رنگ کی پریشانی میں خواب

کھوہ کے باہر سبز جھروکا اس کے پیچھے چاند ہے
جس کی صاف کشش کے آگے رنگ زمیں کا ماند ہے
تیز ضیا چہروں پر آئی کیسے بندھن توڑ کے
کیسی دور دراز جگہوں کے دلکش منظر چھوڑ کے
مٹتے بنتے نقش ہزاروں گھٹتی بڑھتی دوریاں
ایک طرف پر وصل کا قصہ تین طرف مہجوریاں

آغاز زمستاں میں دوبارہ

غروب مہر کا منظر گھڑی ہوئی گزرا
بس ایک پل کو نیستاں اسی طرح لرزا
گیاہ سبز کی خوشبو اسی زمانے کی
اسی طرح کی مسرت بہار آنے کی
وہی جمال در و سقف و بام ہے میں ہوں
کنار رود سیہ خام شام ہے میں ہوں

میں بھی ہوں اپنے ایک خواب میں مست

کوئی ہے شیشہ و شراب میں مست
کوئی ہے لذت شباب میں مست
مبتلا ہیں سبھی کہیں نہ کہیں
میں بھی ہوں اپنے ایک خواب میں مست

جنگ کے سائے میں جنت ارضی کا خواب

کبھی جامن کی شاخوں میں

کبھی فرش زمرد پر

یہ گل دم گا رہی ہے راگنی عہد محبت کی

کھلی چٹیل زمینوں سے

غبار شام میں اڑتی

صدائیں گھر کو واپس آ رہے مسرور لوگوں کی

افق تک کھیت سرسوں کے

گلاب اور سبز گندم کے

حویلی کے شجر پر شور چڑیوں کے چہکنے کا

عجب حیرانیاں سی ہیں

مکانوں اور مکینوں میں

کہ موسم آ رہا ہے گاؤں کے جنگل مہکنے کا

شہر کو تو دیکھنے کو اک تماشا چاہیے

ہے یہ ان کی زندگی کے روگ کا کوئی علاج

ابتدا ہی سے ہے شاید شہر والوں کا مزاج

اپنے اعلیٰ آدمی کو قتل کرنے کا رواج

مارنے کے بعد اس کو دیر تک روتے ہیں وہ

اپنے کردہ جرم سے ایسے رہا ہوتے ہیں وہ

بھیروں بہار کا خیال

لاگی لگن گھر گھر

بت جھڑ کی ہے بہار جلے جیا بار بار
آنکھوں میں انتظار

ڈھلے چاند دل کے پار
لاگی لگن ــــــ

ایک اجنبی دیار
چلے ہوا سوگوار
دل میں وہم بے شمار
ایک دور کی پکار

آ رہی ہے بار بار
لاگی لگن ــــــ

حصہ غزل

کسی انوکھے دشت میں ہوائے غزالان ختن
یاد آتا ہے تمھیں بھی اب کبھی اپنا وطن

خوں رلاتی ہے مجھے اک اجنبی چہرے کی یاد
رات دن رہتا ہے آنکھوں میں وہی لعل یمن

عطر میں ڈوبی ہوئی ہے کوئے جاناں کی ہوا
آہ اس کا پیرہن اور اس کا صندل سا بدن

رات اب ڈھلنے لگی ہے بستیاں خاموش ہیں
تو مجھے سونے نہیں دیتی مرے جی کی جلن

یہ کٹبھو کا لال مکھ ہے اس پری وش کا منیر
یا شعاعِ ماہ سے روشن گلابوں کا چمن

دیتی نہیں اماں جو زمیں آسماں تو ہے
کہنے کو اپنے دل سے کوئی داستاں تو ہے

یوں تو ہے رنگ زرد مگر ہونٹ لال ہیں
صحرا کی وسعتوں میں کہیں گلستاں تو ہے

اک چیل ایک ممٹی پہ بیٹھی ہے دھوپ میں
گلیاں اجڑ گئی ہیں مگر پاسباں تو ہے

✓ آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

مجھ سے بہت قریب ہے تو پھر بھی اے منیرؔ
پردہ سا کوئی میرے ترے درمیاں تو ہے

جمالِ یار کا دفتر رقم نہیں ہوتا
کسی جتن سے بھی یہ کام کم نہیں ہوتا

تمام اجڑے خرابے حسیں نہیں ہوتے
ہر اک پرانا مکاں قصرِ جم نہیں ہوتا

تمام عمر رہ رفتگاں کو تکتی رہے
کسی نگاہ میں اتنا تو دم نہیں ہوتا

یہی سزا ہے مری اب جو میں اکیلا ہوں
کہ میرا سر ترے آگے بھی خم نہیں ہوتا

وہ بے حسی ہے مسلسل شکست دل سے منیر
کوئی بچھڑ کے چلا جائے غم نہیں ہوتا

وہ اک خیال جو اس شوخ کی نگاہ میں تھا
اسی کا عکس مرے دل کی سرد آہ میں تھا

اسی طرح وہ پرانی بہار باقی تھی
عجیب حسن سا اس حزن بارگاہ میں تھا

شفق کا رنگ جھلکتا تھا لال شیشوں میں
تمام اجڑا مکاں شام کی پناہ میں تھا

میں اس کو دیکھ کے چپ تھا اسی کی شادی میں
مزہ تو سارا اسی رسم کے نباہ میں تھا

سواد شہر یہ ہی رک گیا تھا میں تو منیر
اور ایک دشت بلا میرے گھر کی راہ میں تھا

ابر میں برق کے گلزار دکھاتے اس کو
کاش اس رات کبھی جا کے جگاتے اس کو

شہ نشینوں پہ ہوا پھرتی ہے کھوئی کھوئی
اب کہاں ہیں وہ مکیں یہ تو بتاتے اس کو

وہ جو پاس آکے یونہیں چپ سا کھڑا رہتا تھا
اس کی تو خو تھی یہی تم ہی بلاتے اس کو

غم گساری کی طلب تھی یہ محبت تو نہ تھی
درد جب دل میں اٹھا تھا تو چھپاتے اس کو

فائدہ کیا ہے اگر اب وہ ملے بھی، تو منیر
عمر تو بیت گئی راہ پہ لاتے اس کو

یہ بے صدا سنگ و در اکیلے
اجاڑ سنسان گھر اکیلے

چلے جو پی کے تو مستیوں میں
گئے کہاں بے خبر اکیلے

مہیب بن تھا چہار جانب
کٹا تھا سارا سفر اکیلے

ہوا سی رنگوں میں چل رہی ہے
کھڑے ہیں وہ بام پر اکیلے

ہے شام کی زرد دھوپ سر پر
ہوں جیسے دن میں نگر اکیلے

منیر گھر سے نکل کے ہم بھی
پھرے بہت در بدر اکیلے

اک تیز تیر تھا کہ لگا اور نکل گیا
ماری جو چیخ ریل نے جنگل دہل گیا

سویا ہوا تھا شہر کسی سانپ کی طرح
میں دیکھتا ہی رہ گیا اور چاند ڈھل گیا

خواہش کی گرمیاں تھیں عجب ان کے جسم میں
خوباں کی صحبتوں میں مرا خون جل گیا

تھی شام زہر رنگ میں ڈوبی ہوئی کھڑی
پھر اک ذرا سی دیر میں منظر بدل گیا

مدت کے بعد آج اسے دیکھ کر منیر
اک بار دل تو دھڑکا مگر پھر سنبھل گیا

صحن کو چمکا گئی، بیلوں کو گیلا کر گئی
رات بارش کی فلک کو اور نیلا کر گئی

دھوپ ہے اور زرد پھولوں کے شجر ہر راہ پر
اک ضیائے زہر سب سڑکوں کو پیلا کر گئی

کچھ تو اس کے اپنے دل کا درد بھی شامل ہی تھا
کچھ نشے کی لہر بھی اس کو سریلا کر گئی

بیٹھ کر میں لکھ گیا ہوں زخم دل کا ماجرا
خون کی اک بوند کاغذ کو رنگیلا کر گئی

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہیے
پھر اس کی خاک کو بھی اڑا دینا چاہیے

ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اک حشر اس زمیں پہ اٹھا دینا چاہیے

حد سے گزر گئی ہے یہاں رسم قاہری
اس دہر کو اب اس کی سزا دینا چاہیے

اک تیز رعد جیسی صدا ہر مکان میں
لوگوں کو ان کے گھر میں ڈرا دینا چاہیے

گم ہو چلے ہو تم تو بہت خود میں اے منیر
دنیا کو کچھ تو اپنا پتا دینا چاہیے

دل خوف میں ہے عالمِ فانی کو دیکھ کر
آتی ہے یاد موت کی پانی کو دیکھ کر

ہے بابِ شہرِ مردہ گزرگاہِ بادِ شام
میں چپ ہوں اس جگہ کی گرانی کو دیکھ کر

ہل سی رہی ہے حدِ سفر فرطِ شوق سے
دھندلا رہے ہیں حرف معانی کو دیکھ کر

آزردہ ہے مکاں میں خاکِ زمیں بھی
چیزوں میں شوقِ نقل مکانی کو دیکھ کر

ہے آنکھ سرخ اس لبِ لعلیں کے عکس سے
دل خوں ہے اس کی شعلہ بیانی کو دیکھ کر

پردہ اٹھا تو جیسے یقیں بھی اٹھا منیرؔ
گھبرا اٹھا ہوں سامنے ثانی کو دیکھ کر

تند نشہ خمار سا نکلا
آسماں بھی غبار سا نکلا

کیا اندھیرے میں روشنی سی رہی
رنگ لب کا شرار سا نکلا

تلخی غم نکل گئی دل سے
جسم سے اک بخار سا نکلا

دیکھ کر حسن وشت حیراں ہوں
یہ تو منظر دیار سا نکلا

میں ہوں بیمار وصل گل سے منیر
شوق دل مرگ زار سا نکلا

اس شہر کے یہیں کہیں ہونے کا رنگ ہے
اس خاک میں کہیں کہیں سونے کا رنگ ہے

بائیں چمن ہے خود رو درختوں کا جھنڈ سا
محراب در پہ اس کے نہ ہونے کا رنگ ہے

طوفان ابر و باد بلا ساحلوں پہ ہے
دریا کی خامشی میں ڈبونے کا رنگ ہے

اس عہد سے وفا کا صلہ مرگ رائیگاں
اس کی فضا میں ہر گھڑی کھونے کا رنگ ہے

سرخی ہے جو گلاب سی آنکھوں میں اے منیر
خار بہار دل میں چبھونے کا رنگ ہے

شب وصال میں دوری کا خواب کیوں آیا
کمالِ فتح میں یہ ڈر کا باب کیوں آیا

دلوں میں اب کے برس اتنے وہم کیوں جاگے
بلادِ صبر میں اک اضطراب کیوں آیا

ہے آبِ گل یہ عجب اس بہارِ گزراں میں
چمن میں اب کے گل بے حساب کیوں آیا

اگر وہی تھا تو رخ پردہ بے رخی کیا تھی
ذرا سے ہجر میں یہ انقلاب کیوں آیا

بس ایک ہو کا تماشا تمام سمتوں میں
مری صدا کے سفر میں سراب کیوں آیا

میں خوش نہیں ہوں بہت دور اس سے ہونے پر
جو میں نہیں تھا تو اس پر شباب کیوں آیا

اڑا ہے شعلۂ برفِ ابر کی فصیلوں پر
یہ اس بلا کے مقابل سحاب کیوں آیا

یقین کس لیے اس پر سے اٹھ گیا ہے منیرؔ
تمہارے سر پہ یہ شک کا عذاب کیوں آیا

قرار ہجر میں اس کے شراب میں نہ ملا
وہ رنگ اس گلِ رعنا کا خواب میں نہ ملا

عجب کشش تھی نظر پر سرابِ صحرا سے
گہر مگر وہ نظر کا اس آب میں نہ ملا

بس ایک ہجرتِ دائم گھروں زمینوں سے
نشانِ مرکزِ دل اضطراب میں نہ ملا

سفر میں دھوپ کا منظر تھا اور سائے کا اور
ملا جو مہر میں مجھ کو سحاب میں نہ ملا

ہوا نہ پیدا وہ شعلہ جو علم سے اٹھتا
یہ شہر مردہ صحیفوں کے باب میں نہ ملا

مکاں بنا نہ یہاں اس دیارِ شر میں منیر
یہ قصرِ شوق نگر کے عذاب میں نہ ملا

ہری ٹہنیوں کے نگر پر گئے
ہوا کے پرندے شجر پر گئے
اک آسیب زدہ ان مکانوں میں ہے
مکیں اس جگہ کے سفر پر گئے

بہت دھند ہے اور وہ نقشِ قدم
خدا جانے کس رہ گزر پر گئے
کہ جیسے ابھی تھا یہاں پر کوئی
گماں کیسے خواب سحر پر گئے

کئی رنگ پیدا ہوئے برق سے
کئی عکس دیوار و در پر گئے
وہی حسن دیوانہ گر ہر طرف
سبھی رخ اسی کے اثر پر گئے

منیرؔ آج اتنی اداسی ہے کیوں
یہ کیا سائے سے بحر و بر پر گئے

چمن میں رنگ بہار اترا تو میں نے دیکھا
نظر سے دل کا غبار اترا تو میں نے دیکھا

میں نیم شب آسماں کی وسعت کو دیکھتا تھا
زمیں پہ وہ حسن زار اترا تو میں نے دیکھا

گلی کے باہر تمام منظر بدل گئے تھے
جو سایۂ کوے یار اترا تو میں نے دیکھا

خمار میں وہ چہرہ کچھ اور لگ رہا تھا
دم سحر جب خمار اترا تو میں نے دیکھا

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

شعاعِ مہرِ منور شبوں سے پیدا ہو
متاعِ خوابِ مسرت غموں سے پیدا ہو
مری نظر سے جو گم ہو گیا وہ ظاہر ہو
صراطِ شہرِ صفا الجھنوں سے پیدا ہو
گلِ مراد ابسرِ دشتِ نامرادی کھل
رخِ نگارِ وفا محملوں سے پیدا ہو
گماں نہیں مجھے جس سمت سے وہاں سے آ
جو میں نے دیکھی نہیں ان جگہوں سے پیدا ہو
ہویدا ہو دمِ زندہ ہجومِ مردہ سے
اے اصلِ شوق غلط خواہشوں سے پیدا ہو
مثالِ قوسِ قزح بارشوں کے بعد نکل
جمالِ رنگ کھلے منظروں سے پیدا ہو
فروغِ اسمِ محمدؐ ہو بستیوں میں منیر
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو

ان بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
ان امتوں کا ذکر جو رستے میں مر گئیں

کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں

صرصر کی زد میں آئے ہوئے بام و در کو دیکھ
کیسی ہوائیں کیا نگر سرد کر گئیں

کیا باب تھے یہاں جو صدا سے نہیں کھلے
کیسی دعائیں تھیں جو یہاں بے اثر گئیں

تنہا اجاڑ برجوں میں پھرتا ہے تو منیر
وہ زر فشانیاں ترے رخ کی کدھر گئیں

بس ایک ماہ جنوں خیز کی ضیا کے سوا
نگر میں کچھ نہیں باقی رہا ہوا کے سوا

ہے ایک اور بھی صورت کہیں مری ہی طرح
اک اور شہر بھی ہے قریۂ صدا کے سوا

اک اور سمت بھی ہے اس سے جا کے ملنے کی
نشان اور بھی ہے اک نشانِ پا کے سوا

زوالِ عصر ہے کوفے میں اور گداگر ہیں
کھلا نہیں کوئی در بابِ التجا کے سوا

مکان، زر، لبِ گویا، حدِ سپہر و زمیں
دکھائی دیتا ہے سب کچھ یہاں خدا کے سوا

مری ہی خواہشیں باعث ہیں میرے غم کی منیر
عذاب مجھ پہ نہیں حرفِ مدعا کے سوا

کیسی ہے رہگزار وہ دیکھیں گے جا کے اب اسے
بیت گئے برس بہت دیکھا تھا ہم نے جب اسے

جاگے گا خواب ہجر سے آئے گا لوٹ کر یہیں
دیکھیں گے خوف و شوق سے روزن و در سے سب اسے

صحرا نہیں ہے شہر ہے اور بھی لوگ ہیں یہاں
چاروں طرف مکان ہیں اتنا ہے ہوش کب اسے

کہنے کو بات کچھ نہیں جانا ہے اس کو تجھ کو بھی
کیوں تو کھڑا ہے راہ میں روک کے بے سبب اسے

باغوں میں جا اے خوش نوا آئی بسنت کی ہوا
زرد ہوا ہے بن عجب، جادو چڑھا عجب اسے

اک اک ورق ہے باب زر تیری غزل کا اے منیر
جب یہ کتاب ہو چکے جا کے دکھانا تب اسے

اگا سبزہ در و دیوار پر آہستہ آہستہ

ہوا خالی صداؤں سے نگر آہستہ آہستہ

گھرا بادل خموشی سے خزاں آثار باغوں پر

ہلے ٹھنڈی ہواؤں میں شجر آہستہ آہستہ

بہت ہی سست تھا منظر لہو کے رنگ لانے کا

نشاں آخر ہوا یہ سرخ تر آہستہ آہستہ

مرے باہر فصیلیں تھیں غبار خاک و باراں کی

ملی مجھ کو ترے غم کی خبر آہستہ آہستہ

چمک زر کی اسے آخر مکان خاک میں لائی

بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے

کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

سارے منظر ایک جیسے ساری باتیں ایک سی
سارے دن ہیں ایک سے اور ساری راتیں ایک سی

بے نتیجہ، بے ثمر جنگ و جدل سود و زیاں
ساری جیتیں ایک جیسی ساری ماتیں ایک سی

سب ملاقاتوں کا مقصد کاروبار زرگری
سب کی دہشت ایک جیسی سب کی گھاتیں ایک سی

اب کسی میں اگلے وقتوں کی وفا باقی نہیں
سب قبیلے ایک ہیں اب ساری ذاتیں ایک سی

ہوں اگر زیر زمیں تو فائدہ ہونے کا کیا
سنگ و گوہر ایک ہیں پھر ساری دھاتیں ایک سی

ایک ہی رخ کی اسیری خواب ہے شہروں کا اب
ان کے ماتم ایک سے ان کی براتیں ایک سی

اے منیرؔ آزاد ہو اس سحر یک رنگی سے دور
ہو گئے سب زہر رکیاں سب نباتیں ایک سی

شام کے مسکن میں ویراں مے کدے کا در کھلا
باب گزری صحبتوں کا خواب کے اندر کھلا

کچھ نہ تھا جز خواب وحشت وہ وفا اس عہد کی
راز اتنی دیر کا اس عمر میں آ کر کھلا

بن میں سرگوشی ہوئی آثار ابر و باد سے
بند غم سے جیسے اک اشجار کا لشکر کھلا

جگمگا اٹھا اندھیرے میں مری آہٹ سے وہ
یہ عجب اس بت کا میری آنکھ پر جوہر کھلا

سبزۂ نورستہ کی خوشبو تھی ساحل پر منیر
بادلوں کا رنگ چھتری کی طرح سر پر کھلا

ابھی مجھے اک دشت صدا کی ویرانی سے گزرنا ہے

ایک مسافت ختم ہوئی ہے ایک سفر ابھی کرنا ہے

گری ہوئی دیواروں میں جکڑے سے ہوے دروازوں کی

خاکستر سی دہلیزوں پر سرد ہوا نے ڈرنا ہے

ڈر جانا ہے دشت و جبل نے تنہائی کی ہیبت سے

آدھی رات کو جب مہتاب نے تاریکی سے ابھرنا ہے

یہ تو ابھی آغاز ہے جیسے اس پہنائے حیرت کا

آنکھ نے اور سنور جانا ہے رنگ نے اور نکھرنا ہے

جیسے زر کی پیلاہٹ میں موج خون اترتی ہے

زہر زر کے تند نشے نے دیدہ و دل میں اترنا ہے

غیروں سے مل کے ہی سہی بے باک تو ہوا

بارے وہ شوخ پہلے سے چالاک تو ہوا

جی خوش ہوا ہے گرتے مکانوں کو دیکھ کر

یہ شہر خوف خود سے جگر چاک تو ہوا

یہ تو ہوا کہ آدمی پہنچا ہے ماہ تک

کچھ بھی ہوا وہ واقف افلاک تو ہوا

اس کشمکش میں ہم بھی تھکے تو ہیں اے منیر

شہر خدا ستم سے مگر پاک تو ہوا

امتحاں ہم نے دیے اس دار فانی میں بہت

رنج کھینچے ہم نے اپنی لامکانی میں بہت

وہ نہیں اس سا تو ہے خواب بہار جاوداں

اصل کی خوشبو اڑی ہے اس کے ثانی میں بہت

رات دن کے آنے جانے میں یہ سونا جاگنا

فکر والوں کو پتے ہیں اس نشانی میں بہت

کوئلیں کوکیں بہت دیوار گلشن کی طرف

چاند دمکا حوض کے شفاف پانی میں بہت

اس کو کیا یادیں تھیں کیا اور کس جگہ پر رہ گئیں

تیز ہے دریائے دل اپنی روانی میں بہت

آج اس محفل میں تجھ کو بولتے دیکھا منیر

تو کہ جو مشہور تھا یوں بے زبانی میں بہت

اور ہیں کتنی منزلیں باقی
جان کتنی ہے جسم میں باقی

زندہ لوگوں کی بود و باش میں ہیں
مردہ لوگوں کی عادتیں باقی

اس سے ملنا وہ خواب ہستی میں
خواب معدوم حسرتیں باقی

بہہ گئے رنگ و نور کے چشمے
رہ گئیں ان کی رنگتیں باقی

جن کے ہونے سے ہم بھی ہیں اے دل
شہر میں ہیں وہ صورتیں باقی

وہ تو آ کے منیر جا بھی چکا
اک مہک سی ہے باغ میں باقی

بارشوں میں اس سے جا کے ملنے کی حسرت کہاں
کوکنے دو کوئلوں کو اب مجھے فرصت کہاں

جی تو کہتا ہے کہ اس کو ساتھ ہی رکھیں مگر
اپنے پاس اس حسن عیش انگیز کی قیمت کہاں

تلخ اس کو کر دیا ارباب قریہ نے بہت
ورنہ اک شاعر کے دل میں اس قدر نفرت کہاں

روک سکتے تھے اسے ہم ابتدا کے دور میں
اب ہمیں دیوانگی شہر پر قدرت کہاں

دیکھتا ہوں ہر طرف شاید دکھائی دے کبھی
پر فراخ دشت میں آدم کی وہ صورت کہاں

ایک منزل یہ بھی تھی خوابوں کی ورنہ اے منیر
میں کہاں اور اس دیار غیر کی غربت کہاں

ڈرے ہوؤں کو مگر اعتبار کس کا تھا

تمام عمر ہمیں انتظار کس کا تھا

اُڑا غبار ہوا سے تو راہ خالی تھی

وہ کون شخص تھا اس میں غبار کس کا تھا

لیے پھرا جو مجھے در بدر زمانے میں

خیال تجھ کو دلِ بے قرار کس کا تھا

روش سے ہٹ کے بنے اک مکان نو کے قریب

وہ خوں تھا کس کا وہ پھولوں کا ہار کس کا تھا

یہ جبر مرگِ مسلسل ہی زندگی ہے منیر

جہاں میں اس پہ کبھی اختیار کس کا تھا

کیسی کیسی بے ثمر یادوں کے ہالوں میں رہے

ہم بھی اتنی زندگی کیسے وبالوں میں رہے

اک نظر بندی کا عالم تھی نگر کی زندگی

قید میں رہتے تھے جب تک شہر والوں میں رہے

ہم اگر ہوتے تو ملتے تجھ سے بھی جانِ جہاں

خواب تھے ناپید دنیا کے ملالوں میں رہے

وہ چمکنا برق کا دشت و در و دیوار پر

سارے منظر ایک پل اس کے اجالوں میں رہے

کیا تھیں وہ باتیں جو کہنا چاہتے تھے وقتِ مرگ

آخری دم یار اپنے کن خیالوں میں رہے

دور تک مسکن تھے بن ان کی صداؤں کے منیرؔ

دیر تک ان دیویوں کے غم شوالوں میں رہے

کوئی حد نہیں ہے کمال کی
کوئی حد نہیں ہے جمال کی

وہی قرب و دور کی منزلیں
وہی شام خواب و خیال کی

نہ مجھے ہی اس کا پتہ کوئی
نہ اسے خبر مرے حال کی

یہ جواب میری صدا کا ہے
کہ صدا ہے اس کے سوال کی

وہ قیامتیں جو گزر گئیں
تھیں امانتیں کئی سال کی

یہ نماز عصر کا وقت ہے
یہ گھڑی ہے دن کے زوال کی

ہے منیرؔ صبح سفر نئی
گئی بات شب کے ملال کی

کتابِ عمر کا اک اور باب ختم ہوا
شباب ختم ہوا اک عذاب ختم ہوا

ہوئی نجات سفر میں فریبِ صحرا سے
سراب ختم ہوا اضطراب ختم ہوا

برس کے کھل گیا بادل ہوائے شب کی طرح
فلک پہ برق کا وہ پیچ و تاب ختم ہوا

فراغ کوہ و بیاباں ہے اور شامِ سکوں
صعوبتِ غمِ دنیا کا خواب ختم ہوا

جواب دہ نہ رہا میں کسی کے آگے منیرؔ
وہ اک سوال اور اس کا جواب ختم ہوا

اسیر خواہش قید مقام تو ہے کہ میں

نظام شمس و قمر کا غلام تو ہے کہ میں

ہے کون دونوں میں ظاہر ہے کون پردے میں

چھپا ہوا ہے جو نظروں سے دام تو ہے کہ میں

نمائش مہ کامل پہ کس کا سایہ ہے

یہ اس کے چار طرف ابر شام تو ہے کہ میں

اڑا ہے رنگ در و بام باد و باراں سے

نگر کی اس گھنی چپ میں مدام تو ہے کہ میں

مکان دور سے آتی ہے اک صدا سی منیر

بھلا دیا جسے سب نے وہ نام تو ہے کہ میں

انتخاب

پہلے مجموعے

تیز ہوا

اور

تنہا پھول

سے

شبِ ویراں

یوکلپٹس کے پیڑ کے اوپر

ٹھٹھرے تاروں کے پھیلے جنگل میں

چاند تنہا اداس پھرتا ہے

یوکلپٹس کی سرد شاخوں سے

ٹھنڈے جھونکے لپٹ کے روتے ہیں

یوکلپٹس کے پیڑ کے نیچے

خشک پتے ہوا میں اڑتے ہیں

طلسمات

پرے سے دیکھو تو صرف خوشبو، قریب جاؤ تو اک نگر ہے

طلسمی رنگوں سے بھیگتے گھر، نسائی سانسوں سے بند گلیاں

خموش محلوں میں خوبصورت طلائی شکلوں کی رنگ رلیاں

کسی دریچے کی چق کے پیچھے دہکتے ہونٹوں کی سرخ کلیاں

پرے سے تکتی ہر اک نظر اس نگر کی راہوں سے بے خبر ہے

حنائی انگشت کا اشارہ لجائی آنکھوں کی مسکراہٹ

کبھی یونہی راہ چلتے اک ریشمی دوپٹے کی سرسراہٹ

سیاہ راتوں کو ہولے ہولے قریب آتی ہوئی سی آہٹ

یہ ساری راہیں ہیں اُس نگر کی جو دائمی آنسوؤں کا گھر ہے

آخری عمر کی باتیں

وہ میری آنکھوں پر جھک کر کہتی ہے "میں ہوں"

اس کا سانس مرے ہونٹوں کو چھو کر کہتا ہے "میں ہوں"

سونی دیواروں کی خموشی سرگوشی میں کہتی ہے "میں ہوں"

"ہم گھائل ہیں" سب کہتے ہیں

میں بھی کہتا ہوں "میں ہوں"

خواب گاہ

سامنے ہے اک تماشائے بہارِ جانستاں

جا بجا بکھری ہوئی خوشبو کی خالی شیشیاں

نیم وا ہونٹوں پہ سُرخی کے بہت مدھم نشاں

ریشمی تکیے میں پیوست اس کی رنگیں انگلیاں

دیکھ اے دل شوق سے یہ آرزو کا کارواں

رنگ و بو کے سلسلے لعل و گہر کی وادیاں

پھر نہ جانے تو کہاں اور یہ حسیں منظر کہاں

صدا بہ صحرا

چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھٹا گھنگھور

وہ کہتی ہے "کون!"

میں کہتا ہوں "میں ــــ

کھولو یہ بھاری دروازہ

مجھ کو اندر آنے دو ــــ"

اس کے بعد اک لمبی چُپ اور تیز ہوا کا شور

ایک آسیبی رات

کافی دیر گزرنے پر بھی جب وہ گھر نہیں آئی
اور باہر کے آسمان پر کالا بادل کڑکا
تو میرا دل ایک نرالے اندیشے سے دھڑکا

لالٹین کو ہاتھ میں لے کر جب میں باہر نکلا
دروازے کے پاس ہی اک آسیب نے مجھ کو ٹوکا
آندھی اور طوفان نے آگے بڑھ کے رستہ روکا

تیز ہوا نے رو کے کہا "تم کہاں چلے ہو بھائی؟
یہ تو ایسی رات ہے جس میں زہر کی موج چھپی ہے
جی کو ڈرانے والی آوازوں کی فوج چھپی ہے"

میں نے پاگل پن کی دُھن میں مُڑ کر بھی نہیں دیکھا
دل نے تو دیکھے ہیں ایسے لاکھوں کٹھن زمانے
وہ کیسے اِن بھوتوں کی باتوں کو سچا جانے

جونہی اچانک میری نظر کے سامنے بجلی چمکی
میں نے جیسے خواب میں دیکھا اک خونیں نظارہ
جس نے میرے دل میں گہرے درد کا بھالا مارا
خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی اک ننگی مہ پارہ

پھر گھائل چیخوں نے مل کر دہشت سی پھیلائی
رات کے عفریتوں کا لشکر مجھے ڈرانے آیا
دیکھ نہ سکنے والی شکلوں نے جی کو دہلایا

ہیبت ناک چڑیلوں نے ہنس ہنس کر تیر چلائے
سائیں سائیں کرتی ہوا نے خوف کے محل بنائے

سارے تن کا زور لگا کر میں نے اُسے بلایا
"لیلیٰ! لیلیٰ! کہاں ہو تم؟ اب جلدی گھر آجاؤ"

"لیلیٰ! لیلیٰ! کہاں ہو تم؟
"لیلیٰ! لیلیٰ! کہاں ہو تم؟"
عفریتوں نے مری صدا کو اسی طرح دہرایا

لیلیٰ

رات کی اونچی فصیلوں پر دمکتے لال بوٹوں والی کالی جوشنیں خنجر بہ کف

اور فصیلوں سے گھرے جادو بھرے شہروں کی دھندلی روشنی میں ہر طرف

دائروں میں گیت گاتی دُلہنوں کے مرمریں ہاتھوں میں بجتے زرد دف

شش جہت کی تیرگی میں دم بہ دم بڑھنے لگی ہے مور پنکھوں کی صدا

چھا رہا ہے کھڑکیوں پر سرنگوں پھولوں بھری بیلوں کا رنگیں سلسلہ

لگ رہا ہے سُرخ ریشم سے سجے کمروں میں شرمیلی نگاہوں کا رسیلا جمگھٹا

کس حسیں خاموش گلشن میں کھلا ہے میری چاہت کا دمکتی پنکھڑیوں والا گلاب

کون سے جادو بھرے کوچے میں بہتی ہے اُن آنکھوں کی خمار آگیں شراب

کب فصیلِ شب کے اک پوشیدہ دروازے سے جھانکے گا وہ چمکیلا سراب

بول اے آہستہ رو بادِ شبانہ کے نرالے نقش دکھلاتے ہوئے گونگے رباب

بازگشت

یہ صدا

یہ صدائے بازگشت

بے کراں وسعت کی آوارہ پری

سست رَو جھیلوں کے پار

نم زدہ پیڑوں کے پھیلے بازوؤں کے آس پاس

ایک غم دیدہ پرند

گیت گاتا ہے مری ویران شاموں کے لیے

خزاں

ہوا کی آواز

خشک پتوں کی سرسراہٹ سے بھر گئی ہے

روش روش پر فتادہ پھولوں نے

لاکھوں نوحے جگا دیے ہیں

سلیٹی شاہیں بلند پیڑوں پہ غُل مچاتے

سیاہ کوّوں کے قافلوں سے اَٹی ہوئی ہیں

ہر ایک جانب خزاں کے قاصد لپک رہے ہیں

ہر ایک جانب خزاں کی آواز گونجتی ہے

ہر ایک بستی کشاکشِ مرگ و زندگی سے نڈھال ہو کر

مسافروں کو پکارتی ہے کہ "آؤ

مجھ کو خزاں کے بے مہر تلخ احساس سے بچاؤ"

آتما کا روگ

شراپ دے کے جا چکے ہیں سخت دل مہاتما
سمے کی قید گاہ میں بھٹک رہی ہے آتما
کہیں سلونے شیام ہیں نہ گوپیوں کا پھاگ ہے
نہ پائلوں کا شور ہے نہ بانسری کا راگ ہے
بس اک اکیلی رادھکا ہے اور دُکھ کی آگ ہے

ڈراؤنی صداؤں سے بھری ہیں رات کی گپھائیں
اُداس ہو کے سُن رہی ہیں دیوتاؤں کی کتھائیں
بہت پُرانے مندروں میں رہنے والی اپسرائیں
ہوئیں ہوائیں تیز تر بڑھی بنوں کی سائیں سائیں

دوری

دور ہی دور رہی بس مجھ سے
پاس وہ میرے آ نہ سکی تھی
لیکن اُس کو چاہ تھی میری
وہ یہ بھید چھپا نہ سکی تھی

اب وہ کہاں ہے اور کیسی ہے
یہ تو کوئی بتا نہ سکے گا
پر کوئی اس کی نظروں کو
میرے دل سے مٹا نہ سکے گا

اب وہ خواب میں دلہن بن کر
میرے پاس چلی آتی ہے
میں اس کو تکتا رہتا ہوں
لیکن وہ روتی جاتی ہے

برسات

آہ یہ بارانی رات

مینھ، ہوا، طوفان، رقصِ صاعقات

شش جہت پر تیرگی اُمڈی ہوئی

ایک سنّاٹے میں گم ہے بزم گاہِ کائنات

آسماں پر بادلوں کے قافلے بڑھتے ہوئے

اور مری کھڑکی کے نیچے کانپتے پیڑوں کے ہات

چارسو آوارہ ہیں

بھولے بسرے واقعات

جھگڑوں کے شور میں

جانے کتنی دیر سے

سُن رہا ہوں تیری بات

موت

ہر طرف خاموش گلیاں زرد رُو گونگے مکیں

اجڑے اجڑے بام و در اور سونے سونے شہ نشیں

ممٹیوں پر ایک گہری خامشی سایہ فگن

رینگ کر چلتی ہوا کی بھی صدا آتی نہیں

اس سکوتِ غم فزا میں اک طلسمی نازنیں

سُرخ گہرے سُرخ لب اور چاند سی پیلی جبیں

آنکھ کے مبہم اشارے سے بلاتی ہے مجھے

ایک پُر اسرار عشرت کا خزانہ ہے وہ چشمِ دل نشیں

پاگل پن

اک پردہ کالی مخمل کا آنکھوں پر چھانے لگتا ہے

اک بھنور ہزاروں شکلوں کا دل کو دہلانے لگتا ہے

اک تیز حنائی خوشبو سے ہر سانس دہکنے لگتا ہے

اک پھول طلسمی رنگوں کا گلیوں میں چمکنے لگتا ہے

سانپوں سے بھرے اک جنگل کی آواز سنائی دیتی ہے

ہر اینٹ مکانوں کے چھجوں کی خون دکھائی دیتی ہے

ایک رسم

شہر کے گھر سنسان پڑے ہیں
سارے لوگ گھروں سے باہر
چاند کی پوجا کرنے گئے ہیں

وہ ویراں باغوں میں جا کر
چاند نکلتا دیکھتے ہیں
جب مشرق پر روشنی کا
اک تیز نشان دمکتا ہے
وہ سرگوشی کے لہجے میں
کچھ منتر پڑھنے لگتے ہیں

رات گئے تک اسی طرح وہ
چاند کو جلتا دیکھتے ہیں
دوری کے ریگستانوں میں
لہو اُگلتا دیکھتے ہیں

اُپدیش

جگمگ جگمگ کرتی آنکھیں ہیرے جیسے گال

جادو ہے ہونٹوں میں اس کے بجلی جیسی چال

اُس کی حِنائی مُٹھی میں ہے عطر بھرا رومال

جس کی مہک سے شہر بنا ہے خوشبوؤں کا جال

جو اس سارے جگ میں نہیں ہے اس کی چاہ میں مرنا

یہ تو پاگل پن ہے لوگو، ایسا کبھی نہ کرنا

زنداں

شام ہوتے ہی شرابِ عشق پی کر جھومتی شہزادیاں
دوریوں پر مسکراتی نازنینوں کی حسیں آبادیاں
خواہشوں کی آگ میں دن رات جلتے گُل بدن
اطلس و زربفت کے محلوں کی تنہائی میں روتے سیم تن

شرم کی خوشبو سے جُھکتی جارہی معصوم چنچل لڑکیاں
اپنی محبوباؤں کے گُل ریز پہلو میں بہکتے نوجواں
اُجڑے شہروں کے مکانوں کے اکیلے نوحہ خواں
اپنے اپنے دائرے میں ہر کوئی بے چین ہے
گردِ بادِ یاس و غم میں گُم ہے یہ کون و مکان

تنہائی

میں ، نکہت اور سونا گھر
تیز ہوا میں بجتے در
لمبے صحن کے آخر پر
لال گلاب کا تنہا پھول

اب میں اور یہ سونا گھر
تیز ہوا میں بجتے در
دیواروں پر گہرا غم
کرتی ہے آنکھوں کو نم
گئے دنوں کی اُڑتی دھول

(دوسرے مجموعے "جنگل میں دھنک" سے)

زندگی

شام کا سورج خود اپنے ہی لہو کی دھاریوں میں ڈوب کر

دیکھتا ہے بجھتی آنکھوں سے سوادِ شہر کے سونے کھنڈر

اس کو لے جائے گی پل بھر میں فنا کے گھاٹ پر

رات کے بحرِ سیہ کی موج ہے گرمِ سفر

دیکھتی آنکھوں افق کے سرد ساحل پر اندھیرا چھائے گا

ڈوبتا سورج ابھی بھولے دنوں کی داستاں بن جائے گا

سرسراتے ریشمی سایوں سے بھر جائے گی ہر اک رہ گزر

نازنیں آنکھوں کی صورت ٹمٹمائیں گے خیالوں کے نگر

تیز سانسوں کی مہک اُڑتی پھرے گی رات بھر

تو بھی خوش ہو، میرے دل! نوحہ گرِ شام و سحر!!

ماضی

یہ کہنہ محل جس کے رنگیں دریچوں سے لپٹی ہوئی عشق پیچاں کی بیلیں

منڈیروں، ستونوں پہ پھیلی ہوئی سبز کائی

سرِ شام چلتے ہوئے سرد جھونکوں میں سسکاریاں بھر رہی ہے

جہاں اب ہوا اس کے پائیں چمن کے خزاں دیدہ پیڑوں کی

شاخوں پہ سرگوشیوں کے شگوفے کھلانے سے شرما رہی ہے

یہاں ایک دن تھا کہ شیریں صداؤں کے جھنڈ

آرزوؤں کے بھٹکے ہوئے قافلوں کے لیے راحتوں کے نشاں تھے

یہاں ہر دریچہ

حسیں، ہمہماتے، وفا کیش چہروں کی آماجگہ تھا

یہ باغ اَن گنت خوشبوؤں، چہچہاتے پرندوں
گھنیرے درختوں کی اک دل نشیں جلوہ گہ تھا
یہ چُپ چاپ سنگین عمارت تب اتنی پُرانی نہیں تھی

مگر آج جس سمت دیکھو
نگاہوں کے کشکول میں
سونے بام و در و سقف
سوکھے درختوں سے جھڑ کر گرے زرد پتّوں،
چٹختی ہوئی ٹہنیوں کے سوا
کچھ نہیں ہے

جاگو موہن پیارے

چھپے گگن کی اوٹ میں اُس کے نینوں جیسے تارے

دُکھ کا سندیسہ لے کر آئے چاہت کے ہرکارے

آئی نہ ملنے رادھا رانی لاکھ جتن کر ہارے

رات گزر گئی سپنوں والی، جاگو موہن پیارے

گوہرِ مراد

شاموں کی بڑھتی تیرگی میں

برکھا کے سونے جنگل میں

کبھی چاند کی بٹتی روشنی میں

رنگوں کی بہتی نہروں میں

اِن اونچی اونچی کھڑکیوں والے اُجڑے اُجڑے شہروں میں

کن جانے والے لوگوں کی یادوں کے دیے جلاتے ہو

کن بھولی بسری شکلوں کو

گلیوں میں ڈھونڈنے جاتے ہو؟

بھوتوں کی بستی

پیلے منھ اور وحشی آنکھیں
گلے میں زہری ناگ
لب پر سُرخ لہو کے دھبّے
سر پر جلتی آگ

دل ہے ان بھوتوں کا یا کوئی
بے آباد مکان
چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا
اک لمبا قبرستان

چڑیلیں

گھری چاندنی راتوں میں یا گرمیوں کی دوپہروں میں
سونے تنہا رستوں میں یا بہت پرانے شہروں میں

نئی نئی شکلوں میں آ کر لوگوں کو پھسلاتی ہیں
اور پھر اپنے گھر لے جا کر ان سب کو کھا جاتی ہیں
اسی طرح وہ گرم لہو کی پیاس بجھاتی رہتی ہیں
ویرانوں میں موت کا رنگین جال بچھاتی رہتی ہیں

جسم کی خوشبو کے پیچھے دن رات بھٹکتی رہتی ہیں
لال آنکھوں سے رہگیروں کا رستہ تکتی رہتی ہیں

پرتگیا

کیسے میٹھے بول سُنے ہیں پھر بھی میں خاموش رہا ہوں
اپنے ہی غم کے نشے کی تانوں سے مدہوش رہا ہوں

آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا جب اُس نے پرنام کیا تھا
اُس کی اس اندھی پوجا کا میں نے یہ انعام دیا تھا

چلی گئی تو میں نے دل کو یہ کہہ کر سمجھایا تھا
وہ اک شام کا سایہ تھا جو مجھے ستانے آیا تھا

جو ہونا تھا ہو بھی چکا ہے اب میں اور نہ درد سہوں گا
میں بھی اب سے شام کا سایہ بن کر اس کے ساتھ رہوں گا

مَیں اور شہر

سڑکوں پہ بے شمار گلِ خوں پڑے ہوئے
پیڑوں کی ڈالیوں سے تماشے جھڑے ہوئے
کوٹھوں کی ممٹیوں پہ حسیں بُت کھڑے ہوئے

سنسان ہیں مکان، کہیں در کھُلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستہ نہیں
ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

جنگل میں زندگی

پُر اسرار بلاؤں والا
سارا جنگل دشمن ہے

شام کی بارش کی ٹپ ٹپ
اور میرے گھر کا آنگن ہے

ہاتھ میں اک ہتھیار نہیں ہے
باہر جاتے ڈرتا ہوں

رات کے بھوکے شیروں سے
بچنے کی کوشش کرتا ہوں

ویران درگاہ میں آواز

اک بڑی درگاہ تھی اور ہلکی ہلکی چاندنی
مسکراہٹ جیسے پیلے آدمی کی نعش کی

چلتے چلتے میں نے کوئی سرسراہٹ سی سُنی
ہولے ہولے پاس آتی ایک آہٹ سی سُنی

دور تک کچھ بھی نہ تھا معبد کے سایے کے سوا
میری اپنی چاپ ہی سے میرا دل ڈرنے لگا

خوف سے گھبرا کے میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی
اُف خدا! یہ سانس جیسے اک قیامت بن گئی

دیر تک جیسے سفر کرتی ہے گنبد کی صدا
تھا اثر ایسا ہی کچھ اُس میری آہِ سرد کا

صحن سارا سہمی سہمی آہٹوں سے بھر گیا
بڑھ رہا ہو چھپ کے جیسے دشمنوں کا قافلہ

"کون ہے؟" میں اک عجب موجودگی سے ڈر گیا
جیسے کوئی تھا وہاں پر پھر بھی وہ روپوش تھا

"کون ہے؟" "کون ہے؟" "کون ہے"؟
یوں جواب آتا رہا جیسے کوئی بے چین لَے

"کیا یہاں کوئی نہیں ہے؟"
میں نے پھر ڈر کر کہا

"کوئی ہے ـــــ کوئی نہیں ہے
کوئی ہے ـــــ کوئی نہیں ہے"
دیر تک ہوتا رہا

جنگل کا جادو

جس کے کالے سایوں میں ہے وحشی چیتوں کی آبادی

اُس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی

اُس کے پاس ہی ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے

پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چوم رہے تھے

ایک بڑے سے پیڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے

سانپوں جیسی آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے تھے